

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

آزادی دینی مکاتب و مدارس ضرورت، افادیت اور نئے چیلنجز

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علم و تعلیم کی اشاعت و عمومیت کی تحریک اور اس کی سعی و جہد تقریباً ہر ملک میں اور تاریخ کے ہر دور میں، کسی نہ کسی درجہ میں خلوص و ایثار، سادگی اور جفاکشی اور علمی نمونہ و کردار کے ساتھ متصف و مربوط رہی ہے اور اسی میں ناسازگار حالات، سلطنت و معاشرہ کے انقلابات، جابر حکومتوں کی موجودگی، طبعی مرغوبات، معاشی ضروریات، اور ہر زمانہ میں ”معیار زندگی“ بے رحم فرماں روا کی باوجود تعلیم و ثقافت (کلچر) کا ہر دور میں کام ہوتا رہا، نوشتہ و خواندہ کا دائرہ وسعت اور ترقی اختیار کرتا رہا اور زندگی اور مذہب کی بہت سے حقیقتیں اور صداقتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں، اس تاریخی حقیقت کے امتحان و تصدیق کے لئے کہ تعلیمی خدمت کا ہر ملک اور ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں خلوص و ایثار اور سادگی اور جفاکشی سے ربط و تعلق اور باہمی رفاقت رہی ہے، روایتی و عرفی (Traditional) تاریخوں کے بجائے جو سرکار دربار جنگوں اور انقلابات سلطنت اور (سیاسی، انتظامی طور پر) سربراہان و اشخاص سے تعلق رکھتی اور انہیں کے گرد گھومتی ہیں، ماہرین علم و فن اور سماجی خدمت گاروں اور مذہبی پیشواؤں کی سوانح حیات اور تذکرے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہزاروں برس سے انسان لسلوں میں (زبان و تہذیب اور مذہب و عقائد کے اختلاف کے باوجود) جو احساسات و تاثرات نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں، ان میں ایک ”پیشہ ور“ (Professional) اور ”غیر پیشہ ور“ (Non-Professional) میں فرق و امتیاز ہے، آخر الذکر (غیر پیشہ ور) کے ساتھ ہمیشہ احترام و اعتراف اور عقیدت و محبت کا تاثر اور تقلید و اتباع کا (خواہ اس پر عمل نہ ہو سکے) جذبہ اور شوق وابستہ رہا ہے، فطرت انسانی کے اسی دائمی تاثر و رد عمل اور مسلمہ حقیقت کے پیش نظر، ہر دور اور ہر امت میں مبعوث کئے جانے والے پیغمبر نے اپنی قوم میں ہدایت و تبلیغ کا کام شروع کرتے وقت اس کی وضاحت ضروری سمجھی کہ وہ کسی دنیاوی منفعت، مال و دولت اور معاوضہ و اجرت کا طالب نہیں، قرآن مجید کی سورہ شعراء میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ میں سے کسی کے تذکرہ میں بھی ان کے اس بیان اور اطمینان دہانی کو نظر انداز نہیں کیا گیا کہ ”میں تم سے کسی دنیاوی منفعت کا امیدوار نہیں“ ہر ایک کے تذکرہ میں اس کا بیان و اعلان نقل کیا گیا ہے کہ:

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجَرْتُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ

میں تم سے (اس دعوت و نصیحت اور محنت و سعی پر) کسی معاوضہ و منفعت کا طالب نہیں، میرا معاوضہ و انعام

رب العالمین کے ذمہ ہے۔

(۱) پھر جب خدا کا آخری دین اسلام دنیا میں آیا تو اس نے صحیح تعلیم کے کام اعلیٰ درجہ کی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور اس کو انبیاء کی نیابت کا منصب قرار دیا، اس کے نتیجہ میں پورے عالم اسلام میں آزاد دینی تعلیم کا نظام جاری ہوا اور آزاد دینی مدارس و مکاتب کی شکل میں مدرسے اور مکاتب قائم ہوئے اور بالعموم مسجدیں قرآن مجید اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا مرکز بن گئیں، سلاطین وقت کی علمی قدردانی و سرپرستی اور شوق و کوشش کے باوجود اکثر یہ مدارس اور تعلیمی مراکز آزاد رہے اور ان کا براہ راست عوام سے ربط و تعلق رہا اور عوام سے ربط و تعلق کا گہرا نفسیاتی اثر اور فائدہ ظہور میں آیا جو بالکل قدرتی و منطقی ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی ادارہ یا تحریک کی امداد میں براہ راست حصہ لیتا ہے (خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو) تو اس کو اس سے ایک نفسیاتی اور جذباتی تعلق اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ مستحکم اور طویل المیعاد اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور شاہان وقت کی فیاضی اور بعض اوقات دینداری کے باوجود، اس حتمی براعظم کے مسلمانوں کی اسلام سے ارادی و شعوری وابستگی، بقدر ضرورت دینی معلومات اور دینی احکام پر عمل کرنے کا جذبہ، اس آزاد دینی نظام، تعلیم اور انہیں آزاد مدارس کے ایثار پیش اور مخلص فضلاء کی سعی و جہد کا نتیجہ ہے، جس میں مسلم سلطنتوں اور فرماں رواؤں کا تقریباً کچھ حصہ نہیں، تاریخ و حقائق کی روشنی میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وقت تک نہ صرف اس برصغیر کے مسلمانوں کا بلکہ بیشتر یا تمام حتیٰ کہ عرب ممالک تک کے مسلمانوں کا دین و شریعت سے ربط و تعلق اور ان کی دینی باخبری اور اسلامی ثقافت و تہذیب سے نہ صرف واقف ہونا، بلکہ اس کا حامل اور پر جوش حامی ہونا، انہیں ایثار پیشہ، رضا کار اور کسی حد تک زاہد و متوکل فضلاء مدارس اور ناشرین علم دین کا رہن منت ہے۔

ان مدارس کے اساتذہ و فضلاء میں سے متعدد اگرچہ اپنے فن کے ماہر اور یگانہ روزگار عالم ہوتے تھے لیکن وہ

پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ یہ کہنے کے اہل تھا کہ۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلام طغزل و سبزه نہیں میں

جہاں بنی مری فطرت ہے نیکن کسی جشید کا سا غریب نہیں میں

اس آزاد دینی تعلیم کا ایک فائدہ یہ تھا کہ سلاطین وقت کے غلط اور بعض اوقات مخالف اسلام اور ماحی دین

رجحانات، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دین کی بیخ کنی اور استیصال کی باعزم اور منظم کوششوں کا اثر مسلم معاشرہ پر بالکل نہیں

پڑ سکا اور درباریوں اور خوشامدوں کے ایک مختصر حلقہ میں محدود ہو کر رہ گیا، اس کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کی

(جو سلطان ترکی کے بعد اپنے وقت میں دنیا کے اسلام کا سب سے طاقتور اور وسیع المملکت بادشاہ تھا) تحریک وحدت

ادیان، تحلیل شریعت اسلامی، بلکہ تنفیخ دین محمد ﷺ کی منظم اور منصوبہ بند کوشش جس میں اس عہد کے بعض ذکی ترین بلکہ عبقری (Genius) افراد شریک تھے، مسلم معاشرہ پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈال سکی اور جیسا کہ بعض یورپین مؤرخین نے اعتراف کیا ہے، وہ چند رہبری اشخاص تک محدود رہی اور مسلمان عوام اس سے کلی طور پر غیر متاثر رہے اور یہ نتیجہ ان حقانی، ربانی علماء و مصلحین اور داعیان دین کا فیض تھا، جس کا اثر علامۃ المسلمین پر نہ صرف سرکاری درباری علماء سے زیادہ بلکہ سلاطین و حکام سے بھی زیادہ تھا اور جن کے بعض افراد کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۔

جہا نے راڈرگوں کر دیک مرد خود آگا ہے

حکومت سے اسی بے نیازی، علامۃ المسلمین سے ربط و تعلق، اور ایسا جذبہ قربانی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوا اور مسلمان اقتدار اور اس کے منافع و مواقع سے محروم ہو گئے تو اس دینی تعلیم کے نظام و مراکز پر کوئی گہرا انقلاب انگیز اثر نہیں پڑا، بلکہ ان میں مدارس کے قیام کا ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا، جو نہ صرف مسلمانوں کو دینی، جہنی و تہذیبی ارتداد سے محفوظ رکھ سکیں، بلکہ (لحم مملکت کو چھوڑ کر) ہر طرح سے اسلامی سلطنت کی قائم مقامی کر سکیں۔

انگریزی حکومت نے اپنے اقتدار و تسلط اور تعلیمی نظام اور سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی مراکز کی بقا و حیات کی سرچشموں کو خشک کرنے کی ایسی منظم کوشش کی جس کے بعد ان مدارس اور اس دینی تعلیم کے نظام کا باقی رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں اور وہ (تاریخی تجزیہ اور فلسفہ حیات کی رو سے) محض مسلمانوں کے عزم و قوت ایمانی اور شروع سے دینی تعلیم کے آزاد رہنے کا نتیجہ تھا، انگریزی حکومت کے ان انتظامات اور اقدامات کی بعض کڑیاں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طویل اور آہنی زنجیر کا جز ہیں جو کسی نظام تعلیم کے ختم کرنے کے لئے بھی کافی ہے۔

آزہیل مسٹر لفسٹن اور ایف وارڈن نے مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی جس میں حسب ذیل اعتراف موجود ہے:

”ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے لیا منیا ہوئے جاتے ہیں“ (حکومت خود اختیاری، از مولوی سید طفیل احمد صاحب منگلوری علیک ایم۔ ایل سی ص ۹۵)

ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر (W. W. Hunter) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ (The Indian Musalmans) میں ہندوستانی مسلمانوں کی جائز شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے اور ان کو بجا قرار دیا ہے:

”ان (مسلمانوں کو) شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے

اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرہ میں ڈال دیا، ہمارا بوجھ ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقات میں بددیانتی سے کام لیا ہے، ان کے سنت سے بڑے تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا“ (ہمارے

ہندوستانی مسلمان، مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، مطبوعہ اقبال اکیڈمی لاہور ص ۲۱۹۔

سرولیم ہنٹر نے اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و مدارس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ ملک کی سیاسی ہی نہیں، بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے، اس ہندوستانی مدبر کے الفاظ میں جو ان سے بخوبی واقف تھا، ان کا تعلیمی نظام اگرچہ اس نظام تعلیم کے مقابلہ میں کم درجہ پر ہے جسے ہم نے رائج کیا ہے لیکن پھر بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا غلطی ہے، کیوں کہ وہ اعلیٰ دماغی تعلیم و تربیت کا اہل تھا، اس کی بنیادیں بالکل ہی ناقص اصولوں پر نہ تھیں گوان کے پڑھانے کا طریقہ بہت پرانا تھا لیکن یقینی طور پر وہ ہر اس طریقہ سے برتر تھا جو اس وقت ہندوستان میں رائج تھا، مسلمان اس طریق تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیاوی برتری حاصل کرتے“ (ایضاً ص ۲۵۹)

ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد اور غیر سرکاری تعلیم گاہوں کا ذریعہ آمدنی کیا تھا اور وہ کیوں ہر طرح کے سازگار حالات کے باوجود نہ صرف زندہ بلکہ مفید اور کارآمد ہے وہ لکھتا ہے:

”ہم نے ان کے (مسلمانوں کے) طریقہ تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا، جس میں اس کی بقاء کا دار و مدار تھا، مسلمان بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں نھد اس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے، جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا، یہ خاندانی اسکول کم ہوتے گئے اور ان کے اثرات بھی کم ہوتے گئے زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لئے زمین کے قطعات وقف کر دیتے۔“ (ایضاً ص ۲۶۷۔)

حکومت برطانیہ کی اس منظم و مسلح معنوی و ثقافتی نسل کشی (Genocide Cultural) ادواق کی ضابطی، سرکاری ملازمتوں کیلئے فضلاء مدارس کی نااہلی کے قانون اور اس سب سے بڑھ کر قدیم دینی تعلیم کے متوازی پرائمری اور ہائی اسکولوں کی سطح سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ملک گیر نظام کے قائم کرنے اور ان میں ہر طرح کی کشش اور ترغیب کے پہلو کے موجود ہونے کے باوجود، مسلمان اپنے دین اور اس کی ثقافت (کلچر) اور تہذیب و معاشرہ سے وابستہ ہیں اور وہ کسی بڑے پیمانہ پر بلکہ قابل ذکر سطح پر بھی دینی، تہذیبی و ثقافتی ارتداد کا اس طرح شکار نہیں ہوئے، جس طرح اسپین کے مسلمان زوال حکومت اسلامی کے بعد شکار ہوئے، یہ تنہا آزاد دینی تعلیم اور آزاد مدارس و مکاتب اور ان کے فضلاء، وہاں سے تعلیم پا کر نکلنے والے مفتیوں، قاضیوں، واعظوں اور ائمہ مساجد کا فیض تھا اور انہی کی وجہ سے نہ صرف علوم دینیہ بلکہ قرآن مجید پڑھنے اور یاد کرنے کی صلاحیت، اُردو میں نوشت و خواندگی قابلیت اس نسل تک باقی رہی، اس بنا پر عہد جدید کے نامور ترین مفکر اور ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے مدارس عربیہ و دینیہ پر تنقید کرنے والے ایک مسلمان صاحب قلم کی تنقید پر یہ فرمایا کہ ”ان دینی مدارس کو کچھ نہ کہو، اگر یہ باقی نہیں رہے تو ہندوستان بھی اسپین بن جائے گا۔“

ان مدارس اور ان کے فضلاء کی اس خصوصیت اور اس ملک میں اسلام سے واقفیت اور وابستگی کے تسلسل و تواتر میں ان کے عظیم کارنامہ کا بقدر ضرورت اور اضطراب تذکرہ کرنے کے بعد، ہم ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی سامعین، قارئین اور حقیقت پسند اور منصف مزاج مہمان وطن کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا حصہ اسی قدیم نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ فضلاء اور علماء دین کا تھا، آزاد مسلم مفکرین قارئین میں سرفہرست علماء دین ہی تھے، جو سیاسی اور قومی تحریکات میں حصہ لینے کے نہ صرف قائل بلکہ داعی تھے اور سیاست کو مسلمانوں کے لئے (بعض جدید تعلیم یافتہ قارئین کی طرح) ”شجرہ ممنوعہ“ نہیں سمجھتے تھے، انہیں علماء نے برطانوی حکومت کی مخالفت اور اس کے خلاف جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے نتیجے میں مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صادق پوری اور مولوی محمد جعفر تھانوی کو پورٹ انڈمان روانہ کر دیا گیا، مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صاحب کا انڈمان میں انتقال ہو گیا اور مولوی محمد جعفر اٹھارہ سال کی قید ہاشقت اور جلا وطنی کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے، ان کے علاوہ دوسرے ممتاز اور جلیل القدر علماء کو بھی انڈمان میں جلا وطنی کی سزا دی گئی، جن میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کا کوردی اور مفتی اظہار کریم دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں، مولانا فضل حق خیر آبادی کا وہیں انتقال ہوا اور بقیہ دو عالم طویل عرصہ کے بعد وطن واپس ہوئے۔

پھر جب ہندوستان میں تحریک خلافت اور اس کے ساتھ آزادی ہند کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں بھی علماء ہی پیش پیش تھے، اس طویل و نورانی فہرست میں یہاں صرف شیخ الہند مولانا محمود حسن، قیام الدین، مولانا عبدالباری فرنگی بھلی، مولانا معین الدین امیر، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید، ابوالحسن، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا نام لینا کافی ہے، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور مولوی سید وحید احمد کو ۱۹۱۷ء میں مالٹا جلا وطن کر دیا گیا، یہ جماعت ۱۹۲۰ء تک وہیں رہی۔

انگریزوں سے نفرت اور حکومت انگریزی کی مخالفت میں ہر طرح کی سختیاں اور مصائب کے برداشت کرنے کی جس صلاحیت اور ہمت کا ثبوت جماعت علماء نے دیا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہر طرح سے حق بجانب ہوگا کہ دینی تعلیم اور آزاد مدارس میں قربانی و ایثار کا جذبہ ہم عزیمت و عالی ہمتی اور بلند گاہی پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے اور ملک و قوم کو درپیش مصائب و خطرات کے موقع پر یہی جماعت (جو مادی ترقیات، معاشی آسودگی اور عزت و اقتدار کے حصول سے زیادہ آسانی کے ساتھ صرف نظر کر سکتی ہے) زیادہ کام آنے والی ہے۔

اس کے ساتھ ضمناً اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کی آبرو، ذوق مطالعہ اور علم و تصنیف کی راہ میں خود فراموشی اور محنت کوئی انہیں عربی و دینی مدارس سے قائم ہے، انہیں اس سے ایک ایک آدمی نے اکیڑی

کا کام کیا ہے، اس سلسلہ میں ان مصنفین کے تصنیفی کارناموں کا ذکر موجب طوالت و ملال طبع کا باعث ہوگا۔ ان آزاد دینی مدارس و مکاتب کا یہ احسان اور کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اس دور میں اب اردو انہیں کے ذریعہ نئی نسل کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور اس نسل میں اردو نوشت و خواندہ اور قدیم دینی و علمی ذخیرہ سے ربط و تعلق و استفادہ کی صلاحیت انہیں مدارس و مکاتب کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، ورنہ جدید تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والا (اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلبہ تک) اردو میں تحریر و تصنیف کا کیا ذکر؟ اردو میں پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے والدین اور سرپرستوں سے ہندی یا انگریزی میں خط و کتابت کرنے پر مجبور ہیں۔

حضرات! گزشتہ بیان اور معروضات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کسی ملک میں دین سے وابستگی اور ملت کے تشخص کی بقا حکومت کی ان پابندیوں سے آزاد رہنے اور ان قوانین سے مستثنیٰ ہونے میں مضمر ہے، جو ملک کی مادی ضرورتوں کی تکمیل اور عام نظم و نسق کے شوبوں کے لئے ضروری یا مفید ہو سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر مذہداران حکومت صحیح معنی میں حقیقت پسند اور محبت وطن ہوں تو ان کو ہر ایسی کوشش اور ہر ایسے ادارہ کو نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دینی چاہیے بلکہ اس کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرنی چاہیے، جو ملک میں علم و خواندگی اور ثقافت و تہذیب کی اشاعت و ترقی اور ان کی توسیع میں مدد دے کہ اس وسیع، طویل و عریض اور کثیر آبادی کے ملک میں اگر کوئی شخص درخت کے نیچے بیٹھ کر جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے والی خوراک اور بقدر ستر پوشی پوشاک پر قناعت کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کا کام کرے تو ہر محبت وطن انسان اور علم کے ہر قدر دان کو اس کا نہ صرف خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ اس کا شکر گزار ہونا اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ تمام تر سرکاری وسائل اور زیادہ سے زیادہ تعلیم گاہوں کے قیام اور ان کے لئے اساتذہ کی فراہمی کے باوجود اس ملک کی آزادی کے بڑے حصہ کو خواندہ و تعلیم یافتہ نہیں بنایا جاسکتا، چہ جائیکہ اخلاق و سیرت کی تعمیر ہو اور ہر کاردار شہری پیدا ہوں۔

اسی بنا پر ہم حکومت کے ان قوانین و مضوابط کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہیں جو آزاد دینی مدارس و مکاتب کے قیام اور ان کے آزادی سے تعلیمی خدمت اور علم و ثقافت کی اشاعت اور مسلمانوں کو اپنے دین سے اس درجہ واقف کرانے کے کام میں خلل انداز ہوں جو ان کے لئے مذہبی طور پر ضروری ہے اور وہ تعلیم گاہیں یا تو قائم نہ ہو سکیں، یا اگر قائم ہیں تو باقی نہ رہ سکیں مثلاً کم سے کم تنخواہ و معاوضہ (Minimum Wage) کا قانون یا مدارس و مکاتب کے لئے قیام و جواز کے لئے لائسنس لینے کی پابندی جو حکومت کے دوسرے شعبوں جن کا نظم و نسق (Administration) یا (Labour) سے تعلق ہے، کے لئے موزوں ہیں لیکن دینی مدارس و مکاتب کے لئے جن کا شعار اور طاقت و خصوصیات زمانہ قدیم سے لے کر اس وقت تک ایثار قناعت رہی اور ہمیشہ رہنا چاہیے، ناموزوں اور سخت مضرت رساں ہیں۔ ہم اپنا جمہوری، مذہبی، اخلاقی اور شہری حق سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف آواز بلند کریں کہ ملک کے دستور نے ہر اقلیت اور ہر اکائی کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مدارس قائم کرے اور اپنی پسند اور مواصلہ کے مطابق ان کو چلائے۔ ہم

خالص حب الوطنی اور ہندوستان کے لئے اس کو باعث فخر سمجھنے کی بنا پر بھی یہ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور ثقافت و تہذیب کے پھیلانے میں ایثار و قربانی کی اس روایت کو جو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا بھی طرہ امتیاز رہا ہے، باقی رہنا چاہیے۔

آخر میں بڑی معذرت کے ساتھ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھی توجہ دلاتا چاہتا ہوں کہ ان مدارس و مکاتب کے سرکاری الحاق اور سرکاری امداد قبول کر لینے کے بعد یہ اندیشہ ہے (جو واقعہ بن کر سامنے آ گیا ہے) کہ ان مدارس کا عوام سے رابطہ بھی ٹوٹ جائے اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لئے سرکاری امداد اور ایڈ قبول کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پٹنہ کے ایک جلسہ میں شرکت کے موقع پر جو امارت شرعیہ بہار کے قائم کردہ مولانا ابوالحسن محمد سجاد صاحب کی یادگار میں اسپتال کے افتتاح کے لئے منعقد کیا گیا تھا اور جس میں بہار کے چیف منسٹر بھی شریک تھے، ایک عربی مدرسہ کے ذمہ دار نے تقریر میں کہا کہ چھ مہینے سے ہم کو سرکاری امدادی رقم نہیں ملی، ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں، یہ بہار کا حال جہاں اکثر مدارس عربیہ سرکاری امداد قبول کر چکے ہیں، ابھی چند ہی دن پہلے ”قوی آواز“ (لکھنؤ) میں جھانسی کے ایک دینی مدرسہ کے صدر مدرس یا مہتمم صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے، اس میں صاف لکھا گیا ہے کہ پانچ مہینے سے ہم کو سرکاری امداد نہیں ملی اور ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں، ایسی حالت میں بڑے گھائے کا سودا ہو گا کہ ہمارا رشتہ عوام سے بھی ٹوٹ جائے اور ہم ان کی ہمدردی اور اعانت سے بھی محروم ہو جائیں اور حکومت کے تغافل یا اس کے نفق و نسق کی طوالت کا بھی شکار ہوں، اس طرح (بہت معذرت کے ساتھ) صرف اس مصرعہ پر اکتفا کروں گا کہ ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال منم

میں ایثار و قربانی کی اس دعوت کے ساتھ جو کسی نہ کسی درجہ میں دینی تعلیم کی بقا و ملت کے تشخص کی حفاظت کے لئے ضروری ہے، حقائق اور زندگی کی طبعی و فطری بلکہ شرعی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا، مدارس و مکاتب کے اساتذہ و منتظمین کے لئے بقدر ضرورت و باعزت معاشی انتظام کی بے شک ضرورت ہے، مدارس کے ذمہ داروں کو اس پر ہمدردانہ غور کرنا اور اس تقاضہ کو اپنے وسائل اور دائرہ اختیار میں رہ کر پورا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور مدارس و مکاتب کے کارکنوں اور خدمت گذاروں کو کسی نہ کسی درجہ میں ایثار و قناعت کے اجر و ثواب کی امید میں کام کرنے کے ساتھ اس چراغ کو روشن رکھنے اور اس کی روشنی دور دور اور یر تک پہنچاتے رہنے کی کوشش و جانفشانی بھی جاری رکھنی چاہیے کہ اس دین کا ماضی، حال اور مستقبل ایمان و یقین، ایثار و توکل اور عزم حالات اور تیز و تند آندھیوں میں بھی اس چراغ کو گل ہونے سے بچاتا رہا ہے اور بچاتا رہے گا۔

ہوا ہے گوند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مرد رویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

میں اقبالؔ کے اس شعر پر گزارش کا اختتام کرتا ہوں کہ ۔

دل کی آنکھیں شہنشاہی شکستہ ہیں، ہاتھوں میں ہے دل یا شکم